

سزائے قید: جدید قانون سازی کی ضرورت

پروفیسر ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی ۰

گلے گلے بچوں اور انسانی حقوق کی تنظیمیں پاکستان میں قیدی بچوں کو قانون سے ماورا سزائیں دینے اور ان کے حقوق نہ دینے پر سخت تشویش کا اظہار کرتی رہتی ہیں۔ اسی طرح قومی پولیس کے ذریعے خواتین کی سزائے قید اور جیلوں میں ان سے غیر اخلاقی اور غیر انسانی سلوک کے بارے میں احتجاج کیا جاتا رہا ہے۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ پاکستان ایسے ملک میں جہاں آئین کے تحت اسلامی نظام کا نفاذ ہماری قومی اور دستوری ذمہ داری ہے، آج تک اس بات کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ سزائے قید کا بہ حیثیت مجموعی اور خواتین اور بچوں کو سزائے قید دینے کے معاملے کا بالخصوص، کتاب و سنت کی روشنی میں جائزہ لے کر از سر نو قانون سازی کی جائے۔

تعزیرات پاکستان کو شروع سے آخر تک کھنگالیے، جو سزائے قید سے عام نظر آئے گی وہ سزائے قید ہے۔ جو اپنی طوالت یا شدت کے اعتبار سے کم و بیش ہونے کے باوجود بلا امتیاز مرد، عورت، بوڑھے، جوان اور بچوں سب کو دی جاتی ہے، سنگین جرائم میں بھی اور معمولی جرائم میں بھی۔ گویا جو تعزیراتی سزائے قید سے عام ہے، وہ سزائے قید ہے۔

اسلام کے نقطہ نظر سے تعزیرات کی مشروعیت میں حکمت یہ ہے کہ تعزیری سزائے قید جرم سے باز رکھتی ہے۔ اگر کوئی شخص جرم کا ارتکاب کر چکے تو اس کی اصلاح و تادیب کرتی ہے، اور دوسرے لوگوں کو مجرم کے نقش قدم پر چلنے سے روکتی ہے۔ اس لیے ان امور کو پیش نظر رکھا جاتا ہے:

۱۔ ہر جرم کی سزا معاشرتی اور اجتماعی مصلحتوں کے تقاضے کے مطابق ہوتی ہے۔ اگر اجتماعی مصلحت کا تقاضا یہ ہو کہ مجرم کو سنگین سزا دی جائے تو سزا سخت تر ہوتی ہے اور اگر مصلحت تخفیف کی متقاضی ہو تو سزا میں نرمی برتی جاتی ہے۔

۲۔ اگر معاشرتی مصلحت کا تقاضا یہ ہو کہ مجرم سے معاشرے کو پاک کر دیا جائے تو جرم کی نوعیت کے اعتبار سے اسے سزائے موت یا غیر محدود مدت کی قید کی سزا دی جاتی ہے۔

۳۔ جو سزائیں مجرم کی اصلاح اور معاشرے کو اس کی مجرمانہ کارروائیوں سے بچانے کے لیے دی جاتی ہیں ان میں کسی متعین سزا (مثلاً اتنے سال قید وغیرہ) پر اصرار کرنا درست نہیں بلکہ ہر فرد کی نفسیات اور ارتکاب جرم کے حالات کو دیکھتے ہوئے ایسی سزا دی جائے جس سے اس کی اصلاح ہو۔

۴۔ مجرم کی اصلاح اور اس سے انتقام لینے میں بنیادی فرق ہے۔ اصلاح کے لیے سزا کی وہی حیثیت ہے جیسے ایک باپ اپنے بیٹے کو کسی لغزش پر سرزنش کرتا ہے یا ایک طبیب مریض کی جان بچانے کے لیے آپریشن کرتا ہے۔ ان دونوں بہ ظاہر بے رحمانہ کارروائیوں کے پس پردہ بے پناہ رحمت و شفقت کا جذبہ موجزن ہوتا ہے۔ اسی طرح جرم کے لیے سزا کے تعین میں ایک ماہر سرجن کی طرح یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جرم کا مرض کس حد تک ہے اور مجرم کس حد تک سزا کا آپریشن برداشت کر سکتا ہے۔

۵۔ افراد معاشرہ کے درمیان جو معاشرتی تفاوت موجود ہوتا ہے، سزا کے تعین میں اسے بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ کسی بہت باعزت شخص کے لیے بعض حالات میں یہی سزا کافی ہوتی ہے کہ اسے احساس دلایا جائے کہ یہ کام اس کے منصب و مرتبے کے مطابق نہیں ہے، جب کہ کسی جرائم پیشہ فرد کے لیے ان الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ رسول اللہ نے فرمایا: اَقْبِلُوا ذَوِي الْهَيْئَاتِ عَشْرًا تَمَّ إِلَّا الْحُدُودُ (مسند احمد بن حنبل، ۶: ۱۸۱، نیل الاوطار، ۷: ۱۳۳-۱۳۴)۔ باعزت لوگوں کی معمولی لغزشوں سے صرف نظر کر لیا کرو۔

جہاں تک سزائے قید کے جواز کا تعلق ہے تو قرآن حکیم کی دو آیات سے اس پر استدلال کیا گیا ہے۔ پہلی آیت کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ جو لوگ اسلامی ریاست میں فتنہ و فساد اور شرانگیزی کا ارتکاب کریں، ڈاکے ڈالیں، یا قتل و غارت کے مرتکب ہوں، ان کو ان کے جرائم کی نوعیت کے اعتبار سے سزائے قید سے بے کر سزائے موت تک دی جاسکتی ہے۔

سورة المائدة میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ط (المائدة ۵: ۳۳) جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لیے تک و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں، ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں، یا سولی چڑھائے جائیں، یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے

آیت کے مطابق مذکورہ چار سزاؤں میں سے کوئی بھی سزا دی جاسکتی ہے۔

دوسری آیت سورۃ النساء میں ہے:

وَالَّتِي يَأْتِيَنَّ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِسَائِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةٌ مِمَّنْ جَ فَإِنْ شَهِدُوا فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّى يَتَوَفَّيَهُنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا (النساء ۴: ۱۵) تمہاری عورتوں میں سے جو کوئی بے حیائی کا ارتکاب کرے تو اس پر چار گواہ لاؤ۔ اگر وہ گواہی دے دیں تو انہیں گھروں میں بند کر دو تاکہ وہ فوت ہو جائیں یا اللہ ان کے لیے کوئی اور راہ نکالے۔

احادیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص پر کوئی الزام تھا۔ رسول اکرمؐ نے اسے کچھ وقت، غالباً ۲۴ گھنٹے کے لیے نظر بند رکھا لیکن اس پر الزام ثابت نہیں ہوا تو اسے چھوڑ دیا گیا (ابوداؤد ۴: ۷۴)۔ ایک دوسرے موقع پر رسول اکرمؐ نے ایسے معاملے میں کہ ایک شخص کسی کو پکڑے رہے اور دوسرا اسے قتل کر دے، یہ فیصلہ فرمایا کہ قاتل کو قصاص میں قتل کر دیا جائے اور پکڑنے والے کو عمر قید کی سزا دی جائے (دارقطنی ۳: ۱۳۰، بیہقی ۸: ۵۰)۔

عہد نبویؐ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور خلافت میں باقاعدہ کوئی قید خانہ نہیں بنایا گیا۔ اس لیے بعض حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ سزائے قید دینا سرے سے جائز ہی نہیں ہے، البتہ کسی شخص کو نظر بند کیا جاسکتا ہے، اس پر کوئی نگران کھڑا کیا جاسکتا ہے یا اگر کوئی شخص قرض کی ادائیگی میں بلاوجہ لیت و لعل سے کام لے رہا ہو تو قرض خواہ سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ قرض دار کا پیچھا نہ چھوڑے (المغنی ۴: ۳۹۹، الطرق الحکمیہ: ۶۲-۶۳، سبل السلام ۳: ۵۵)۔ لیکن عہد نبویؐ یا عہد صدیقیؓ میں مستقل قید خانہ نہ بنانے سے سزائے قید کا ناجائز ہونا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اس وقت ضرورت نہیں سمجھی گئی ہوگی، جب کہ حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں مکہ میں صفوان بن امیہ کا مکان چار ہزار درہم میں خریدا اور اس میں جو گو شاعر الحطیبہ کو قید کیا، التمیمی کو جو قرآن حکیم کی بعض آیات کے بارے میں اوٹ پٹائی کرتا تھا قید رکھا، اور ابو محجن النخعی کو بار بار شراب نوشی کی وجہ سے قید کیا۔ حضرت عثمان غنیؓ نے ایک پیشہ ور چور اور ٹھک ضابی بن الحارث کو عمر قید کی سزا دی۔ اسی طرح حضرت علیؓ نے بھی کچھ لوگوں کو قید کیا (الطریق الحکمیہ: ۱۰۲، الفیضۃ الرسول: ۵، التعزیر فی الشریعہ الاسلامیہ: ۲۹۶)۔

فقہائے اسلام نے قرآن و حدیث میں سزائے قید کے جواز کے تمام دلائل کی روشنی میں یہ بتایا ہے کہ قید کی صرف درج ذیل تین صورتیں جائز ہیں:

۱۔ کوئی شخص پیشہ ور مجرم ہے اور لوگوں کو اس کے شر سے بچانے کا بجواس کے، کوئی طریقہ نہیں ہے کہ اسے قید کر دیا جائے۔ اسے تاحیات یا تو بہ کر کے اپنی اصلاح کرنے تک سزائے قید دی جائے۔

- ۲۔ جس کے ذمے اللہ یا بندے کا کوئی حق ہے اور وہ شرعی جواز کے بغیر اس حق کی ادا گی میں کوتاہی کر رہا ہے۔ اسے اس وقت تک قید رکھا جاسکتا ہے جب تک وہ حق ادا نہ کرے۔
- ۳۔ جس شخص پر کوئی الزام ہے اسے قید کیا جاسکتا ہے تا آنکہ اس کی ضمانت نہ ہو جائے یا اس کے بارے میں تحقیق مکمل نہ ہو جائے۔

ان تینوں صورتوں کے پیش نظریہ کننا درست ہے کہ سزائے قید کی مدت مقرر کرنا، یا اسے عمومی سزا کے طور پر رواج دینا اسلامی قانون تعزیرات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ کیونکہ اول الذکر مجرموں کو ساری عمر معاشرے سے الگ رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے انہیں تاحیات سزائے قید دی جاتی ہے۔ البتہ ان کے لیے توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے اور توبہ سے مراد زہنی کلامی توبہ نہیں بلکہ اصلاح احوال ہے، یعنی وہ کسی بھی وقت اپنی زندگی کا بیج بدل کر معاشرے میں واپس آسکتے ہیں۔ دوسری صورت میں قید کا مقصد سزا دینا نہیں ہے بلکہ حقوق کی ادا گی ہے اور جو وہ شخص حق ادا کر دے اسے فوری طور پر رہائی مل جاتی ہے۔ جب کہ تیسری صورت میں اسلامی قانون عدل کا تقاضا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو، تحقیق کر کے اگر جرم ثابت ہو جائے تو سزا دی جائے ورنہ چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ رسول اللہ نے صرف ۲۴ گھنٹے بعد اور ایک دوسرے واقعے میں تقریباً ایک گھنٹے بعد ایسے ملزم کو رہا کرنے کا حکم دے دیا تھا (نبیل الاوطار ۷: ۱۵۸-۱۵۹)۔

جہاں تک خواتین کی سزائے قید کا تعلق ہے تو قرآن حکیم کے صریح الفاظ یہ ہیں ”انہیں گھروں میں بند کر دو“ (النساء ۴: ۱۵)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خواتین کو جیل خانوں میں بھیجنا قرآن حکیم کی منشا کے مطابق نہیں ہے۔ قرآن کریم کی رو سے اگر انہیں قید کرنا پڑے تو انہیں گھروں میں، جہاں ان کے محرم رشتے داروں کی آزادانہ آمدورفت ہو اور ان کی عزت و عصمت کے تحفظ کے مسائل نہ پیدا ہوں، وہاں قید کیا جائے۔ اور اگر خواتین کو جیل خانوں میں ہی بھیجنا ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کے جیل خانے انہیں اسی طرح تحفظ مہیا کرنے والے ہوں جیسا کہ ایک خاتون کو اپنے گھر میں حاصل ہوتا ہے۔ نیز قرآن حکیم کی آیت (البقرہ ۲: ۲۲۶) کی روشنی میں کسی بھی شادی شدہ جوڑے کو چار ماہ یا اس سے زائد ایک دوسرے سے الگ رکھنا جائز نہیں۔ اسی اصول کی بنا پر حضرت عمرؓ نے تمام شادی شدہ فوجیوں کو چار ماہ کے بعد لازمی چھٹی پر گھر بھیجنے کے احکامات جاری کیے تھے (شبلی نعمانی، العلوف، ص ۳۳۵)۔ چنانچہ کسی بھی شادی شدہ مرد یا خاتون کو سزائے قید دیتے ہوئے قرآن حکیم کے اس حکم کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

نابلغ بچوں کو سزائے قید دینے کے بارے میں فقہاء کی آرا کا حاصل یہ ہے کہ اگر نابلغ لڑکا خود کاروبار یا تجارت کرتا ہو اور کسی کا ایسا مالی نقصان کرے جو قابل تعزیر ہو تو اس کے بجائے اس کے باپ یا

سرپرست کو اس وقت تک قید رکھا جائے جب تک کہ مالی نقصان پورا نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ بچے کا جرم درحقیقت والدین یا سرپرست کی تربیت کی خامی ہے جس کی اسے سزا ملنا چاہیے۔ بعض علما نے اس صورت میں بچے کو اس وقت تک قید رکھنے کی اجازت دی ہے جب تک والدین یا سرپرست نقصان کی تلافی نہ کر دے (المبسوط ۲۰: ۹۱)۔

فوج داری جرائم میں بچے کو سزا کے طور پر قید نہیں رکھا جاسکتا، البتہ تادیب اور اصلاح کے لیے اسے قید کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ سزائے قید موجب اصلاح ہو۔ اکثر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ عورتوں کی طرح بچوں کو بھی ولی یا سرپرست کے گھر قید کیا جائے۔ انھیں عام قید خانوں میں نہ رکھا جائے (حاشیہ ابن عابدین ۴: ۲۵۷، ۵: ۲۲۶، المغنی ۸: ۱۱۵)۔

اگر سزائے قید کو اس پہلو سے دیکھا جائے کہ تعزیری سزا میں جو حکمت و مصلحت کارفرما ہوتی ہے، کیا سزائے قید سے وہ مقاصد حاصل ہوتے ہیں؟ تو درج ذیل امور سامنے آتے ہیں:

۱۔ قید کی سزا بجائے خود ملکی ترقی کے لیے سدراہ ہے۔ اگر اس بات کا حساب کیا جائے کہ ملک بھر میں قیدیوں کی کل تعداد کتنی ہے اور اس میں سے کتنے ایسے ہیں جو اپنی صلاحیتیں پیداواری کاموں میں صرف کر کے ملک کی تعمیر و ترقی میں حصہ لے سکتے ہیں لیکن باوجود کوشش کے ان کے لیے جیل خانوں میں مناسب کام میا نہیں کیے جاسکے تو چشم کشا صورت حال سامنے آئے گی۔ ان کی صلاحیتیں اور قوت کار ضائع ہوتی ہے۔ اس سے ایک طرف قومی آمدنی میں کمی واقع ہوتی ہے اور دوسری طرف ان کے اخراجات اور ان کی وجہ سے جیل خانوں پر اٹھنے والے بھاری اخراجات قومی خزانے پر بوجھ بنتے ہیں، جب کہ سزائے قید کے علاوہ بھی تعزیرات کے ایسے طریقے ہیں جن کو بروئے کار لا کر لوگوں کو جرائم سے باز اور محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔ اور اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کو کام سے معطل کر کے ان کے اخراجات قومی خزانے پر ڈالنے کے عمل کو بھی ختم کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ اگر سزائے قید سے کوئی اصلاح کی صورت پیدا ہوتی تو اتنے بھاری اخراجات برداشت کرنے کا جواز بھی تھا۔ لیکن مشاہدات و تجربات سے معلوم ہوتا ہے کہ قید خانے اصلاحی مراکز بننے کے بجائے جرائم کی تربیت کے مراکز ہیں۔ جیلوں میں بسا اوقات ایسے لوگ بھی چلے جاتے ہیں جو طبعاً اور حقیقتاً جرائم پیشہ نہیں ہوتے بلکہ کسی اتفاقی حادثے میں ان سے کوئی جرم سرزد ہو جاتا ہے اور وہ جرائم سے نفرت کرتے ہیں لیکن جب ایک بار جیل یا تارا کر آتے ہیں تو وہاں انھیں ایسے ایسے ماہرین فن کی صحبت میسر آتی ہے کہ ان پر ایک نئی دنیا کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ عیب اور بدنای کا جو داغ، دامن پر ایک بار اتفاقاً لگ چکا ہوتا ہے وہ اسے فن کی بلندیوں تک پہنچانے کا عزم لے کر جیل سے باہر آتے ہیں۔

۳۔ سزائے قید میں غالباً سرے سے یہ صلاحیت ہی نہیں ہے کہ وہ جرائم سے باز رکھنے میں ایک موثر عامل ثابت ہو، کیوں کہ اعداد و شمار سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جو لوگ جتنی سخت سزائے قید بھگت کر آتے ہیں، باہر آکر اسی قدر بڑا جرم کر کے واپس قید خانے پہنچ جاتے ہیں۔ اگر سزائے قید جرائم سے باز رکھنے میں موثر ہوتی تو سزا بھگت کر آنے والے افراد دوبارہ ان جرائم کا ارتکاب نہ کرتے۔

۴۔ سزائے قید کا ایک اور اثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ اس کی وجہ سے احساس ذمہ داری ختم ہو جاتا ہے۔ جو شخص ایک طویل مدت تک اپنے افراد خانہ کی ضروریات کی کفالت کی ذمہ داریوں سے دور، سرکاری نان منصفی پر پرورش پاتا ہے، اس کے دل سے رفتہ رفتہ یہ احساس ہی جاتا رہتا ہے کہ آدمی کو اپنی اور اپنے کنبے کی ضروریات کی کفالت کے لیے خود جدوجہد کرنی چاہیے۔ مزید برآں معاشرے میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو جاتا ہے جو اپنی سزائے قید کو باعث فخر سمجھتا ہے اور اسے پُر امن شہریوں سے کیش کرواتا ہے۔ چنانچہ تمام شہروں میں نام نہاد پہلوانوں کے گروہ جو شہریوں سے بھتہ وصول کرتے ہیں اور ان پر اپنا رعب و دبدبہ رکھتے ہیں، ہمارے جیل خانوں کی پیداوار ہیں۔ اور جب ان ہی پہلوان نما افراد کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے تو پورے معاشرے کی زمام کار جرائم پیشہ طبقے کے ہاتھ میں آجاتی ہے جو کسی بھی ملک، قوم اور معاشرے کے لیے تباہی کا آخری درجہ ہے۔

۵۔ جیل خانوں میں غیر صحت مند ماحول، طبی سہولتوں کی کمی، جگہ کی قلت اور افراد کی کثرت کے باعث گوناگوں طبی اور اخلاقی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ قیدی بے شمار جلدی، صدری اور جنسی امراض لے کر معاشرے میں پھیل جاتے ہیں۔

انہی اسباب کی بنا پر اسلامی نظام تعزیرات میں سزائے قید کو کبھی عمومی پذیرائی حاصل نہیں ہوئی۔ سزائے قید کی حیثیت روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی برائیوں کے سدباب کے لیے معمولی سزا کی تھی کہ چند روز کسی شخص کو قید میں رکھ کر تنبیہ کر دی جائے۔ اور ایسے لوگ چونکہ دوبارہ جیلوں میں نہیں آتے اور ان کی تعداد بھی زیادہ نہیں ہوتی اور جیلوں میں ان کا قیام بہت مختصر ہوتا ہے، اس لیے اس سے وہ خرابیاں پیدا نہیں ہوتیں جو طویل سزائے قید کا ورثہ ہیں۔ اس طریق کار کی وضاحت امام ابو یوسفؒ کی اس تحریر سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے ہارون الرشید کی درخواست پر اس کی حکومت کے لیے نظام کار کے طور پر تیار کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

اگر آپ حدود کے نفاذ کے لیے احکام جاری کر دیں تو قیدیوں کی تعداد کم ہو جائے گی اور جرائم پیشہ لوگ اپنی شرارتوں سے باز آجائیں گے۔ قیدیوں کے معاملات پر توجہ دینا بہت ضروری ہے۔ اس لیے آپ اپنے حکام کو ہدایت کریں کہ ہر چند روز کے بعد قیدیوں کے معاملات کا جائزہ لیں۔ جسے سزا

دینی ہو، سزا دے کر آزاد کر دیں اور جس پر جرم ثابت نہیں ہوا، اسے فوراً چھوڑ دیں اور سزا دینے میں حد سے تجاوز نہ کریں (کتاب الخراج)۔

تمام اسلامی فقہاء تعزیر کے طور پر بدنی سزا (کوڑے مارنا) دے کر مجرم کو فوری طور پر رہا کرنے کے قائل رہے ہیں تاکہ وہ اپنے جرم کی سزا بھگت کر اپنی روزمرہ زندگی میں واپس چلا جائے اور آئندہ کے لیے محتاط زندگی گزارے۔ یاد رہے کہ اسلامی نظام تعزیرات کے کوڑوں اور مارشل لائی کوڑوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ تعزیری کوڑے کا مقصد سزا دینا ہے۔ جان سے مارنا، زخمی کرنا یا ناکارہ کر دینا نہیں ہے۔

ان تمام امور کے علاوہ یہ بات بھی قتل غور ہے کہ قیدیوں کی دیکھ بھال اور ان پر اٹھنے والے اخراجات جو ہر سال کروڑوں تک پہنچ جاتے ہیں، سرکاری خزانے سے پورے کیے جاتے ہیں۔ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لیے ملک کے شہری ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ گویا قیدیوں کے اخراجات کی ذمہ داری اس معاشرے پر ڈال دی گئی ہے جس کے خلاف جرم کر کے وہ سزائے قید بھگت رہے ہیں۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ایک طرف معاشرہ جرائم پیشہ افراد کے ہاتھوں زخم خوردہ ہے اور دوسری طرف اپنے خلاف جرم کرنے والوں کی کفالت کی ذمہ داری کے زیر بار ہے۔ اس صورت حال میں یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ سزائے قید کی صورت میں اصل سزا معاشرے کے بے گناہ افراد کو دی جاتی ہے جو دو گنا ہے، زیادتی کا شکار بننے کی اور ٹیکس دے کر مجرموں کو پالنے کی بھی۔ کیا قانون ساز اداروں کا فرض نہیں ہے کہ وہ ان حقائق پر غور کریں؟

ہماری تجویز یہ ہے کہ تعزیرات پاکستان اور اس نوعیت کے دوسرے قوانین کا جائزہ لے کر تعزیری نظام کی اصلاح کے لیے اقدام کیا جائے یا وفاقی شرعی عدالت جس کے پاس کتاب و سنت کی روشنی میں قوانین کا از خود جائزہ لینے کا اختیار موجود ہے، اپنے اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے موجودہ قوانین کو جانچنے کے اقدامات کرے۔ سب سے بہتر طریق کار یہ ہو گا کہ تعزیرات پاکستان میں پوند کاری کے بجائے پورے تعزیراتی قانون کو کتاب و سنت کے مطابق مدون کر کے اسے قانون ساز اداروں سے منظور کرایا جائے۔

ترجمان القرآن کا زر تعاون سالانہ اندرون ملک کے لیے اب ۲۰۰ روپے سالانہ ہے۔ بیرون ملک شرح میں بھی ۵۰ روپے کا اضافہ ہوا ہے۔ تفصیل پہلے مسمخے پر ملاحظہ فرمائیے۔